اردو مکتوبات میں اخلاقی اور فلسفیانہ عناصر

غلام مصطفیٰ فاروق [1]، ڈاکٹر میمونہ سبحانی**

Abstract:

"Ethics is that part of philosophy which deals with good and bad or right and wrong. Basically, all the religions came for the completion of ethics and gave a clearer picture of humanity. Philosophy and ethics have two distinct spheres; Ethics pursuit of one's own happiness while philosophy has to do with other people's interest. From the very beginning of letter writing, the concepts of ethics and morality remained the integral part of Urdu letters. While discussing Urdu letters, the roots of ethics and morality come from its culture and civilization. Urdu letters not only showed and bowed towards the moral values and virtuous behavior like condolence, sympathy, encouraging the depressed, love and care, humanity and hospitality but also have philosophical discussion like time and space, humanity, current problems of era, life and death, patience and steadfast and science and religion. This article is an effort to bring forth the ethical and philosophical perspective of Urdu letter writing from its beginning."

اخلاق ایک انسانی صفت ہے اوراسے انسانیت کا مترادف بھی کہاجاسکتا ہے۔ لفظ اخلاق کا تعلق عربی سے ہے لیکن یہ اردو میں بھی من و عن معانی میں مستعمل ہے۔اخلاق کے صحیح معانی و مفاہیم سے شناسائی کے لیے لغات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرہنگِ آصفیہ کے مطابق اخلاق ، خلق کی جمع ہے اور اس سے مراد ہے:

''عادتیں، خصلتیں، خوش خوئی، ملن ساری، کشادہ پیشانی سے ملنا، خاطر، مدارت، آؤبھگت، وہ علم جس میں معاد و معاش،تہذیبِ نفس، سیاستِ مدن وغیرہ کی بحث ہو۔''(۱)

لفظ ''اخلاق''باقاعدہ طور پر ادب کا حصہ بننے سے قبل مذہب سے وا بستہ رہا ہے ۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اولین انسان حضرت آدمؑ جو کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی بھی تھے ، ان سے آں حضرت □ تک تمام انبیا نے عالمی فلسفہ اخلاق کی تبلیغ کی اور انسانوں کو تقویٰ ، خشیتِ الٰہی وزہد کے ذریعے قربِ الٰہی حاصل کرنے کے تلقین کی ۔ تمام آسمانی کتب نہایت محترم اور فلسفہ اخلاق ہی کا مجموعہ ہیں ۔ مذہب اور اخلاقی اقدار و روایات باہم منسلک ہیں ۔اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:

''و انک لعلی خلق عظیم ''(والقلم:۴)

(اوربے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔)

حضرت سیدہ عائشہؓ نے مکارم اخلاق کے حوالے سے ان کی تعداد دس بیان فرمائی ہے اور ان مکارم کی فہرست کچھ یوں آئی ہے:

''حق گوئی،اطاعت خداوندی،ضرورت مندکی امداد، حسنِ سلوک کے عوض حسن سلوک ،رشتوں کو جوڑنا، امانت داری،پڑوسی کے حقوق ، ساتھیوں کے حقوق ،مہمان داری ، حیا کرنا ۔''(۲)

مذہب اخلاق کی تکمیل کے لیے آتا ہے اور بد اخلاقی ، بد افعالی و ایسے ہی دیگر برے خصائل سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے۔ فلسفہ اخلاق کے دائرے میں عدل و انصاف، مہر و محبت، خلوص عظمتِ انسانی ، سچائی ، امانت، دیانت ، علم و حکمت، ما بعد الطبیعات ، تصوف ، انسان دوستی ، جواں

---

[1]پی ایچ ڈی سکالر (اُردو)، جی سی یونیورسٹی ، فیصل آباد

** اسسٹنٹ پروفیسر ،شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

مردی ، شجاعت، استقامت، عدل و انصاف، تواضع، حلم و انکساری ، ترکِ خواہشات ، محبت اور دوستی، قناعت پسندی ، ایثار ، قربانی ، صبرو تسلیم و رضا،عزتِ نفس ، نیکی و سعادت مندی اور امن و محبت ایسے اجزا شامل ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ در حقیقت یہ وہ مدارج ہیں جنھیں بلا شبہ بین الاقوامی اقدار کہا جاسکتا ہے۔ ادبیاتِ عالم میں اخلاقیات کی بازگشت کی بات کی جائے تو اخلاق کی روایت کے بارے میں محمد حفظ الرحمن سیوہاروی نے اسے مذہب ہی سے جوڑا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''دنیا نے اخلاق کا نام سب سے پہلے مذہب کی زبان سے سنا۔ تاریخ کا جو باب قبل از طوفان شمار کیا گیا ہے اس میں ایک پیغمبر حضرت نوح ؑ اپنی قوم کے سامنے اخلاق کا درس دیتے نظر آتے ہیں اورنسلِ انسانی کے باپ حضرت آدم ؑ کے بعد یہی وہ پہلے رسول ہیں جن کی تبلیغ و تعلیم کو تاریخ نے اپنے اوراق میں جگہ دی ہے۔ ''(۳)

اخلاق کا اولین تعلق مذہب سے رہا لیکن اس کے بہت بعد اس کا تعلق یونان نے فلسفے سے جوڑا اور یہ باقاعدہ فلسفے کا نہایت اہم حصہ بن گیا۔ اس پر مزید تحقیق کے نتیجے میں ذیلی مباحث جمالیات و احساسات تک شامل ہوتے گئے۔ یونان میں سب سے پہلے فسطائیوں اور پھر ارسطو کے ہاں اس کے مباحث زیرِ قلم آتے رہے ۔ارسطو نے اس پر باقاعدہ کتاب ''علم الاخلاق'' تحریر کرکے اس علم کی بنیاد کو باقاعدگی بخشی ۔فلسفہ چوں کہ آزادانہ تحقیق پر منحصر ہوتا ہے اس لیے اس میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوئیں اور اپنی من مانی کے نتیجے مینیورپ غیر اخلاقی اقدار کی جانب تیزی سے راغب ہوتا گیا ۔ مذہب کو دوبار ہ سے اس کے رد کے طور پر اپنایا گیا ۔ '' قرآن کا فلسفہ اخلاق '' میں سید احمد عروج نے بھی الہامی مذاہب کے بعد اس کا تعلق یونانیوں سے جڑتے ہوئے دکھایا ہے ۔ انھوں نے فلسفہ اخلاق کی نہ صرف بازیافت کی کوشش کی بلکہ اس سے متعلق اہم سوالات بھی اٹھائے جیسےیہ کہ یہ فلسفہ بذاتِ خود کیا ہے؟۔اسکی حدود و قیود کیا ہیں اور اس کے دائرہ اختیار میں کون سے عوامل شامل ہیں۔یونانیوں کے نزدیک اس کے اہم مباحث کی نشان دہی اوران سوالات کے جوابات کی تلاش کی کوشش کی ہے۔البتہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ فلسفہ اخلاق کے مرتبین میں سقراط کے اولین نام کا ہر گز مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے اخلاقی خیالاتیا اخلاقیات ہی کا وجود نہ تھا اور ارسطو کی وجہ سے یہ فلسفہ اچانک رونما ہوگیا۔ اس سے قبل بھی اخلاقی تصورات اور خیالات دنیا میں رائج تھے ۔سید احمد عروج اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> "انسانی اعمال کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے اصول وقوانین کیا ہیں ؟ ان کے اسباب و علل کیا ہیں ؟ ان کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس وقت سے لے کر آج تک فلسفہ اخلاق ان سوالات پر بحث کر رہے ہیں لیکن ان سوالا ت کا متعین اور یقینی جواب حاصل نہیں کرسکے۔''(۴)

اردو مکاتیب میں فلسفہ اخلاق پر نظر ڈالتے ہوئے روایت کا جائزہ لیا جائے تو اردو میں مکتوب نگاری بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ عمومی طور پر غالب کو پہلا مکتوب نگار سمجھا جاتا ہے لیکن یہ درست نہیں ۔ رجب علی بیگ سرور(1782-1869)، غلام غوث بے خبر(1824-1905)اور دیگر نثر نگار اردو مکاتیب کا سلسلہ غالب سے بھی پہلے سے روا رکھے ہوئے تھے ۔ البتہ غالب کی آسان پسندی اور بے تکلفی کا انداز عوام میں ایسا رواج پایا کہ انہیں بلا شرکت غیرے اردو کا پہلا صاحبِ طرز مکتوب نگار تسلیم کر لیا گیا اور ان کا انداز تا حال قائم ہے۔ اسی لیے جب اردو میں اخلاقی و فلسفیانہ مباحث کاذکر آتا ہے تو متقدمین و موخرین دونوں کے ہاں دیکھنا پڑتا ہے کہ اس دور میں ایسے کون سے اخلاقی و فلسفیانہ مضامین موجود تھے ۔ عمومی طور پر غالب سے قبل اخلاقی مضامین تو مکاتیب میں موجود ملتے ہیں لیکن ان میں الگ سے کوئی زمانی مکانی فلسفے دکھائی نہیں دیتے ۔ اسی طرح غالب کے ہاں بھی عمومی طور پر فلسفہ جبرو قدر ، موت و حیات وغیرہ ہی کا زیادہ بیان ملتا ہے۔سر سید احمد خان (1817-1898)کے خطوط عمومی طور پر خشک اور دفتری انداز کے حامل ہیں البتہ ان میں ان کا عجز و انکسار بڑا واضح دکھائی دیتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے خطوط کی فلسفیانہ جہت بھی اخلاقیات کے گرد ہی گھومتی دکھائی دیتی ہے اس میں دیگر فلسفہ ہائے زندگی کی رمق کم موجود ہے۔ شبلی کے خطوط میں وہ نسبتاً

سخت رویہ اپنائے نظر آتے ہیں بالخصوص ان کے ندوۃ العلوم کے حوالے سے تحریر کیے گئے خطو ط میں وہ نصاب کے حوالے سے خاصا سخت رویہ اپنا ئے ہوئے ہیں جب کہ اس کے برعکس ان کے عطیہ فیضی کے نام خطوط میں وہ سراپا محبت اور انکسار نظر آتے ہیں ۔ عبدالماجد دریا آبادی کے خطوط کی بڑی تعدا دتعزیت کے لیے ہی مختص ہے اور ایسے خطوط کی تعداد جلد اول و دوم میں دو سو بیس سے زائد نظر آتی ہے۔ یعنی ان کے ہاں بھی فلسفہ اخلاق ہی دیگر تمام فلسفوں پر حاوی دکھائی دیتا ہے اور وہ ہمدردی کو شرفِ انسانیت کا تاج سمجھتے ہوئے اعزا و احباب کو خطوط تحریر کرتے ہیں ۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط میں بھی وہ ایک عمدہ نثر نگار اور مزاح نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں لیکن مزاح نگاری کا عنصر اخلاقیات کے آگے دبتا چلا جاتا ہے۔ ایک اہم بات ان کےخطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ امن پسندی اور صلح جوئی کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں اور اپنی ادیبانہ عظمت کے اعتراف کے بجائے عجز و انکسار سے کام لیتے ہیں ۔ اردو میں حقیقت میں فلسفہ اخلاق کے علاوہ دیگر فلسفوں کا چلن ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے ہاں ملتا ہے البتہ ایسا نہیں کہ دیگر مکاتیب نگار کے ہاں یہ روایت ہر گز موجود ہی نہ ہو۔درحقیقت کسی بھی شخصیت کے خطوط اس کے نجی زندگی میں جھانکنے، اس کی اخلاقیات سمجھنے اور اس کے بیان کردہ فلسفوں کو جانچنے کے حوالے سے نہایت اہم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقاراس حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ:

''جب کسی شخصیت کے خطوط کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان میں وحدتِ فکر و احساس کی تلاش عبث ہوتی ہے۔ خطوط در حقیقت انسان کی طبیعت کی طرح متنو ع اور رنگا رنگ ہوتے ہیں ۔'' (۵)

اردو کے ابتدائی نثر نگاروں میں سے رجب علی بیگ سرور کے خطوط جو کہ رقعات کی صورت ہی میں ہیں اور باقاعدہ ایسے خطو ط نہیں جیسے بعد میں تحریر کیے گئے، فلسفہ اخلاق و دیگر فلسفے مل جاتے ہیں ۔ ان کے محمد مرتضیٰ خان صاحب بہادر المتخلص بہ بقا جو کہ وزیر نواب خواجہ اللہ خان بہادر تھے، کے نام رقعات تھے، جس میں غمِ دوراں، فلسفہ صبرو تسلیم و رضا، مو ت و حیات اور زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ فلسفۂ صبر و تسلیم و رضا انسانی زندگی کے اطمینان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مشکلات پر صبر، بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی ارادوں کا ٹوٹنا اور اس پر اللہ کی رضا کو تسلیم کرنا اور رضا برضائے الٰہی رہنا ایسے اعمال ہیں جن سے انسانی زندگی قرار پاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی ذہنی دباؤ کا عارضی یا مستقل طور پر شکار ہوتا ہے ۔ ایسے میں اسے چاہیے کہ صبر کادامن تھامے اور اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرتا رہے۔ یہی فلسفہ صبر ہے۔مزاج پرسی ، بیمار پرسی اور تعزیت ایسی اخلاقی اقدار ہیں جو بہت دیر پا اثر رکھتی ہیں اور باہمی پیار محبت کو بڑھانے اور مہر و محبت پیدا کرنے کا اہم ذریعہ بھی ہیں ۔ اردو مکاتیب اپنے آغاز سے ہی ایسی حسین اخلاقی اقدار سے معمور رہے ہیں۔ رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

''بعد از سلام اور اشتیاق ملاقات کہ جس کی انتہا نہیں مطلب طرز بصد سوزو گراز ہوں۔ بعد مدت مہربانی نامہ ملاتمھارا آیا ۔ اسے روز سیاہ دکھایا ۔ اس بلبل کے اجاڑنے سے گلزار جہاں نظر میں خزاں ہے مگر بجز صبر کے چارہ کہاں ہے ۔ اللہ تم کو بھی صبر عنایت کرے اور نعم البدل اس کا دے۔''(۶)

اردو کے بالکل ابتدائی خطوط بھی اخلاقیات کا عمدہ نمونہ رہے ہیں ۔ گوکہ ان میں دقیق اخلاقی فلسفوں کی بہتات نہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اسلوب اور سادگی میں بھی اخلاقیات موجود ہیں ۔ ان میں حقیقت پسندی ہے، براہِ راست کلام ہے اور القاب و آداب سے خطوط کے اختتام تک سب کچھ نہایت عمدگی سے نبھایا گیا ہے۔ غالب نے بھاری بھرکم القاب و آداب کا خاتمہ کرکے خطوط کو مراسلے سے مکالمہ بنانے کا اہتمام تو کیا تھا لیکن ان القاب و آداب کی چاشنی اور ان کے ذریعے مکتوب الیہ کو دی جانے والی وہ عزت افزائی کسی حد تک کم ہوگئی تھی۔ اردو ادب میں اولیں خطوط نگاروں میں رام موہن بھی شامل ہیں جن کے خطوط کی تاریخ۱۸۳۱ ء سے شروع ہوتی ہیں ۔ ذیل میں ان کی جانب سے گارسیں

دتاسی کوبھیجے گئے ایک خط کا ایک حصہ ملاحظہ کیجیے۔ اس میں خط پہنچنے پر مسرت کا اظہار اور اپنی موجودگی کا بیان خوبصورت اور عین لحاظ و مروت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

''رقعہ مبارک پہنچا ونبدہ کو مسرور و مغرور کیا۔ قدر علی الاطلاق آپ کو اس یادآوری کے ساتھ سلامت رکھے۔ تین مہینے سے زیادہ بند ہ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ انشا اللہ تعالیٰ عن قریب پارس میں مشرف خدمت ہوگا اور آپ کی توجہ سے جناب شیزی صاحب کو ملاقات حاصل کرے گا۔''(۷)

اردو مکاتیب میں اولین نمونوں میں خواجہ غلام غوث بے خبر کے خطوط بھی ملتے ہیں۔ چوں کہ متحدہ برصغیر پاک و ہند کی روایات اخلاق و پاسداری کی علامت تھی اس لیےیہ اقدار و روایات ان کی زندگی کے ہر گوشے سے جھلکتی دکھائی دیتے تھے ۔ ان کی رسوم و رواج، نشست و برخاست کے انداز اور مزاج پرسی ، ہر ایک میں مہر و محبت اور خلوص و اخلاق جھلکتا ہے ۔ دہلوی اور لکھنوی تہذیب میں ایک دوسرے سے رابطے میں رہنا نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ خطوط کا ہم روزہ جواب بھی وہ فرض ِعین سمجھتے تھے اور اگر جواب نہ ملتا تو بے چین ہوجاتے ۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال خواجہ غلام غوث بے خبر کے ایک مکتوب میں مرزااسد اللہ خاں غالب کے حوالے سے ملتی ہے۔ وہ غالب ہی کے انداز میں تحریر کرتے ہیں کہ کیوں کر میری جانب آپ کا خط نہیں آتا، کہیں مجھے آپ بھول تو نہیں گئے۔ خط کایہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

''کیوں مخدوم ، آپ کو کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک فقیر گوشہ نشیں، درویش عزلت گزیں ، بے خبرّ دل حزیںّ ، نام میرا دعاگوئے قدیم، الہ آباد میں رہتا ہے۔ کچھ اس کی تو خبر لیں کہ وہ ہے یا کیا ہوا؟ ''(۸)

غلام امام شہید کے خطوط بھی غالب سے پہلے موجود ملتے ہیں ۔ ان پر تحقیق ہوچکی ہے اور یہ تدوین بھی کیے جاچکے ہیں ۔ ان خطوط میں بھی ایسے بہت سے اہم نکات بیان کیے گئے ہیں جو فلسفہ اخلاق کے حوالے سے اہم ہیں ۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''انشائے بہار بے خزاں '' درحقیقت۱۸۶۶ء میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا اور یہ مکتوب نویسی سکھانے کے لیے لیفٹننٹ گورنر جیمس ٹامس کی خواہش پر تحریر کیا گیا تھا۔ ان خطوط کی کثرت چوں کہ فرضی ہیں لیکن خطوط کی تعریف پر مکمل پورے اترتے ہیں۔ ان خطوط میں فلسفہ اخلاق کئی حوالوں سے سامنے آتا ہے مثلاً خیر و عافیت دریافت کرنا،دوری پر شدت غم کا اظہار کرنا، تعزیت کرنا، مزاج پرسی کرنا ، عزیزوں اور دوستوں کے لیے محبت کا اظہارکرنا وغیرہ۔ جس میں وہ ان کی جدائی میں سراپا غم نظر آتے ہیں ۔ ان کے الفاظ میں نہ صرف ان کے بھائی کی جدائی کا منظر نظر آتا ہے بلکہ ان کے لیے محبت، پیار اور ان کے بنا زندگی ادھوری ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''بھائی میرے جیتے رہو ۔جب سے تم گھر سدھارے میرا جی بہت بے چین رہتا ہے۔ ڈیوڑھی میں اداس بیٹھا رہتا ہوں ، میں تو بہتیرا چاہتا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں پر کیا کروں یہی سوچ رہتا ہوں کہ جاؤں تو کہاں جاؤں اور رہوں تو جی نہیں مانتا کہ بڑا اندھیرا ہے کہ تمھیں نہ دیکھوں اور جیتا رہوں ۔ اب مجھے جینے کا آسرا نہیں ہے آگے اس کے کیا لکھوں۔''(۹)

مرزا غالب (1797-1869)کے خطوط میں فلسفہ اخلاق کی بات کی جائے تو ان کے بیش تر خطوط عمدہ اخلاقیات کا نمونہ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ دوستوں کی خوشی میں خوش اور غم میں غمگین نظر آتے ہیں ، ان کو نصیحتیں کرتے ہیں ، ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں ، انھیں جینے کا درس دیتے ہیں اور ان کی خاطر جو بن پڑتی ہے ، کر گزرتے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خان غالب کا مرزا ہرگوپا ل تفتہ کے نام خط کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے جس میں ان کی اخلاقیات کے ذیلی موضوعات کے طورپر عاجزی و انکساری، مہرو محبت اور خلوص جھلکتا ہے۔ غدر کے بعد کا یہ خط جغرافیائی تاریخ کا بھی نمونہ ہے جس میں انگریز کے قابض ہونے کے بعد کے حالات درج ہیں ۔ غالب اکیلے رہ گئے تھے اس لیے دوستوں سے مسلسل خط و کتابت میں رہتے تھے۔ مرزاہرگوپال تفتہ کا خط اگر ذرا سا بھی دیر سے پہنچتا یا جواب میں تاخیر ہوتی تو پریشان ہوجاتے۔ ان کا کوئی ایک بھی دوست ایسا نہ تھا جو زندہ سلامت ہو

اور وہ اس سے مکاتیب کی راہ سے رشتہ جوڑے ہوئے نہ ہوں ۔ یادِ ماضی میں لپٹا ان کا یہ خط ان کی خوش اخلاقی کی ایک مثال ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''مجھ سے کیوں خفا ہو ؟ آج مہینابھر ہوگیا ہوگا یا بعد دو چاردن کے ہوجائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا ۔ کوئی وقت ایسانہ تھا کہ میرے پاس دوچار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شوجی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا،یہ دوشخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں ۔''(١٠)

ان کے دوستوں میں چوں کہ صرف مسلمان نہ تھے بلکہ ہر قوم اور مذہب کے لوگ شامل تھے اس لیے بھی غالب کی شخصیت کوعمدہ انسانی خصائص و اخلاق کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ انسانوں کو مذہب کے بجائے محض انسانی سطح پر پرکھتے ، دوستی رکھتے اور تعلقات بنانے اور نبھانے پر ایمان رکھتے تھے۔پروفیسر سید وقار عظیم غالب کے خطوط میں شرفِ انسانیت کی بات کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ان کی اخلاقیات فردِ واحد سے اجتماعیت کی جانب سفر کرتی ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ فرد کے مصائب کو سمجھتے تھے بلکہ ان کا بیان اجتماعیت کو نشان زد کرتا تھا ۔ وہ ان کے خطوط کے خصوصی حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ ان کی تحاریر ان کے انسانیت کے لیے درد کی پرچھائی اور پرتو ہے۔ اسی لیے ان کے اس ضمن میں فلسفے ایک وقت یا ایک نسل کے لیے نہیں بلکہ آفاقیت رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہیں ۔پروفیسر سید وقار عظیم کے مطابق غالب کے خطوط کی نمایاں ترین خصوصیت ان کا انسانیت کے لیے محبت اور خلوص کا رشتہ ہی ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''ان خطوں میں ایک عہد کی یاد اور اس یاد کی بھرپور کسک موجود ہے ۔ اس لیے کہ غالب کو قدرت نے سلیقہ دیا ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کے درد کی ساری چبھن اور ساری کسک کو اپنے اندر جذب کرلے اور اسے یوں اپنی ذات میں سمولے کہ وہ دردِ غالب کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے ہر قطرے میں حل ہوجائے اور پھر لہو بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ غالب کے خط ہمیں اس غالب کا جلوہ دکھاتے ہیں جو اپنی ذات سے آگے بڑھ کر ایک عہد بن گیا ہے ۔''(١١)

سر سید احمد خان(1817-1898) بھی غالب کے معاصرین میں شامل تھے اور اپنی ذات میں خود ایک جامعہ کا درجہ رکھتے تھے۔ سر سید احمد خان کی مسلمانوں کے لیے جدو جہد کسی سے چھپی ہوئی نہیں ۔ انھیں اردو کا پہلا مضمون نگار ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے ۔ان کی غالب سے بھی خط و کتابت ہوئی ہے جس کا ثبوت سرسید کی کتاب آثار الصنادید پر لکھے جانے والی غالب کی تقریظ تھی۔وہ غالب ہی کی طرح عام فہم اور سادہ اسلوب میں خطوط تحریر کرتے تھے اور ان کی زندگی کے مقاصد محض ادبی مقام ومرتبہ کاحصول نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے سیاسی مقاصد کے لیے متحرک رہے۔ ان کے خطوط میں ان کے دلی جذبات، فلسفہ اخلاق اور دیگر فلسفوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ وہ ساری زندگی اپنی تحاریر سے فروغِ ادب کا کام بھی کرتے رہے اور علم کی خدمت بھی ۔ان کی کتب کی طرح ان کے خطوط میں بھی انسان دوستی اور عمدہ اخلاقی نمونے با آسانی مل جاتے ہیں ۔ان کے خطوط کی تدوین کرنے والے سر راس مسعود ان کے مکتوبات کے آغاز میں خطوط میں انسان دوستی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ سر سید علیہ الرحمۃ اپنے قوم اور ملک کے ایک بڑے رفارمر (مصلح) مانے گئے ہیں ۔

ان کے خطوط سے مہر و محبت، بھائی چارہ ، خیر سگالی اور پاسداری ایسے جذبات کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے۔ یہ تمام صفات چوں کہ اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے با آسانی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے خطوط فلسفہ اخلاق سے باہر نہیں نکلتے تھے ۔ سر سید کا کوئی ایک بھی خط ایسانہیں ہے جس میں وہ خود سے اختلاف رکھنے والے اشخاص کو لعن طعن کا نشانہ بناتے ہوں۔ وہ اصولی موقف کی بات کرتے تھے اور جواباً بھییہی چاہتے تھے۔پروفیسر صغیر افراہیم تحریر کرتے ہیں:

''محبت، مروت، بھائی چارے ، پاسداری اور خیر سگالی جیسے جذبات و احساسات سے ان کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔ رفیقِ خاص مولوی سمیع اللہ سے کسی بات پر اختلاف بڑھا جس کی وجہ

سے انھیں تکلیف پہنچی۔ نواب محسن الملک کے نام لکھے خط سے جذبۂ دوستی اور تکلیف دونوں کا احساس جلوہ گر ہے۔‘‘(۱۲)

اردو خطوط نگاری جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہمیشہ ہی سے روشن اقدار و روایات کی امین رہی ہے اس لیے مشاہیر کے خطوط کی بات ہویا عوام الناس کے خطوط کی ، ان میں ایک خاص تہذیب چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس طرح نشست و برخاست کے آدا ب ہوتے ہیں ، یہی آداب ہمیں خطو ط میں بھی نظر آتے ہیں ۔ ایک دوسرے کے لیے عزت اور اپنی عزتِ نفس کی آبیاری ہمیشہ سے اردو خطوط کا حصہ رہی ہے۔ اسی حوالے سے دور آفریدی کے نام امتیاز علی عرشی کے خط کا نمونہ ملاحظہ کیجیے جس کا سن تحریر ۱۸۶۲ء ہے اس میں مولاناامتیاز علی عرشی تدوینِ دیوانِ غالب پر ملنے والے انعام کی مبارک باد وصول کرنے کے بعدیوں شکریہ بجا لاتے ہیں کہ اس میں کامیاب و کامران زندگی کی دعا اور محبت و خلوص سب کچھ در آتا ہے ۔

تمھارا مبارک باد کا خط ملا۔ کتنا دل چسپ اور پر خلوص ہے ۔ وہ خط خدا تمھیں خوش و خرم رکھے اور کامیاب و کامراں زندگی عطا کرے۔ شاہد صاحب سے ملاقات ہو تو میری دعا کہنا ۔ دیگر احباب کو بھی سلامِ شوق ۔زیادہ دعا۔ (۱۳)

درج بالا خط میں یہاں شاہد سے مراد شاہد علی خاں مکتبہ جامعہ بمبئی کے مینجر ہیں۔

اردو غز ل کو نیا رنگ و آہنگ دینے والے مشہور غزل گو علی سکندر المتخلص جگر مراد آبادی کی ابتدائی شاعرانہ زندگی کے بارے میں مورخیں نے تحریر کیا ہے کہ وہ بہت زیادہ شراب کے عادی تھے لیکن بعد ازاں وہ نہ صرف تائب ہوگئے تھے بلکہ انھوننے نعت نگاری میں بھی نام کمایا تھا۔ آخری عمر میں جب کہ وہ بہت علیل ہوچکے تھے تو ان سے لکھنا پڑھنا چھوٹ گیا تھا لیکن خطوط کا جواب دینا وہ پھر بھی اپنی اہم ذمہ داری تصور کرتے تھے ۔ ان کے خطوط میں سے درج ذیل خط کاایک حصہ ملاحظہ کیجیے جو کہ نہ صرف ان کی عاجزی ، انکساری اور علیل ہونے کے باوجود جواب تحریر کرنے کے حوالے سے عمدہ اخلاقیات کا نمونہ ہے بلکہ اس میں نثر کا اسلوب بھی سادہ اور سلیس ہے۔حوصلہ مندی سے اپنے کاہلے پن کا احساس اور اس کی ترجمانی کر تے ہوئے یوں تحیر کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ کہیں بد دل نہ ہوں:

’’عزیزِ گرامی قدر سلمہ میں سخت علیل تھا۔ اب صحت یاب ہوا ہوں لیکن ضعف و نقاہت ہنوز باقی ہے۔ آپ کے خطوط تشنہ جواب رہے ۔ مجھے خود بھی اپنی جگہ افسوس ہے۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے ہیں صبح نو بجے کی ٹرین سے لکھنو جا رہا ہوں ۔ واپسی۲۵ تک ہوجائے گی ۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کس درجے کا کاہل انسان واقع ہوا ہوں ۔تمام ڈاک کے جوابات آخری موقع کے لیے رکھ چھوڑتا ہوں ۔‘‘ (۱۴)

شاد عارفی (1903-1964)بھی اردو کے نمایاں ادیبوں میں شامل رہے ہیں ۔ ان کی زندگی بھی خدمت و فروغِ ادب سے تعبیر رہی ہے۔ دور آفریدی کے نام ان کے مکاتیب میں سے ایک مکتوب کا حصہ ملاحظہ کیجیے جو کہ ان کی آخری عمر سے متعلق ہے۔ا س میں وہ خرابی صحت کے باوجود لکھتے ہیں کہ محض اسی لیے جواب تحریر کررہے ہیں کہ یہ عین اخلاقی عمل ہے ورنہ وہ بیٹھ سکنے کے قابل بھی نہیں اور لیٹ کر جواب تحریر کررہے ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ کسی کے کلام پر تبصرہ کرنا وہ اس لیے پسند نہیںکرتے کہ وہ کسی کی دل آزار ی نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی کسی سے الجھنا چاہتے ہیں ۔ چوں کہ کوئی بڑا شاعر ہے اور کوئی چھوٹا شاعر لیکن ادب کی خدمت سبھی لوگ کر رہے ہیں اس لیے وہ یہ تبصرہ تحریر نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی خلاقیات جواب نہ دینے سے قاصر ہے ۔ ملاحظہ کیجیے:

’’لفافہ ملا مگرمیں ابھی تک سخت علیل چل رہا ہوں ۔ لکھنا پڑھنا بالکل بند ہے ۔ یہ خط بڑی الجھن کے ساتھ آدھا لیٹ کر لکھ رہا ہوں ۔ وہ بھی اس لیے کہ جواب ضروری تھا ۔ کیونکہ اس میں مجروح سلطان پوری سے، اپنی پوزیشن کلیر کرنا تھی اور یہ کہ مجھ سے وہ غلطی ہوئی نہیں ، کرائی گئی تھی ۔ ‘‘(۱۵)

انھیں کا ایک اور خط ملاحظہ کیجیے جس میں ان کی طبیعت پہلے سے زیادہ خرا ب معلوم ہوتی ہے ۔ پہلے خط میں وہ محض اٹھنے بیٹھنے سے مجبور دکھائی دیے تھے اس خط میں تحریر کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پاؤں پر لرزہ طاری ہے اور لکھنے سے بالکل مجبور اور بے بس ہیں لیکن اخلاقاً جواب پھر بھی تحریر کررہے ہیں ۔ اس کے بعد بڑی عاجزی سے تحریر کرتے ہیں کہ جن الفاظ میں ان کی ذات کو سراہا گیا ہے ،وہ محض ادبیت ہے حقیقت نہیں۔ در اصل یہ فلسفہ نفی ذات ہے ۔ یعنی جس قدر بھی بڑی شخصیت ہو ، اسی قدر زیادہ عاجزی کا اظہار اور اپنی ذات کی نفی کردینا تاکہ کسی قسم کا کوئی غرور یا اس کا شائبہ بھی نہ ہونے پائے۔مہدی افادی کے خطو ط کا ذکر کریں تو ان کا شما ر بلا شبہ اردوکے اہم انشا پردازوں میں ہوتا ہے ۔ان کی نثر کا اپنا ہی ایک الگ رنگ و ڈھنگ تھا جس میں شوخی اور شرات کا عناصر بدرجہ اتم تھے۔ وہ مولانا شبلی نعمانی کی تحریر سے متاثر تھے اور خودمولاناشبلی نعمانی ان کی تحاریر کو ہمیشہ سراہتے تھے ۔

مہدی افادی(1813-1921) کے خطوط کا بغور جائزہ لیا جائے تو ان میں شوخی اور شرارت کے عناصر موجود ہیں لیکن یہ کبھی بھی اخلاقیات کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ اپنے موقف پر مثبت رائے پیش کرتے ہیں جو مدلل بھی ہوتی ہے اور جامع بھی ۔عبدالماجدریا آبادی ایسے صاحب الرائے شخص سے ان کی خط و کتابت جاری رہی جس میں ان سے اختلافات بھی ہوئے اور اتفاق بھی ۔وہ ان کی حوصلہ افرائی بھی کرتے رہے اور ان کی گروپ بندی پر تنقید بھی لیکن کسی بھی خط میں خواہ وہ اتفاق کا ہو یا اعتراض کا ، انھوں نے صبر اور اخلاق کا دامن نہ چھوڑا۔بہت سے مقامات پر ان کی اخلاقیات فردِ واحد سے دامن چھڑا کر عالم گیریت کا دامن تھام لیتی ہے۔ ایک ایسا ہی خط بنام شبلی نعمانی کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے جس میں وہ بڑی محبت کے ساتھ معاشرے کی بگڑی صورتِ حال پر دکھ کا اظہار، قوم کے مستقبل کے حوالے سے اظہارِ خیال اور مولانا شبلی نعمانی کی خدمات کو سراہتے ہیں جن کی وجہ سے آہستگی سے لیکن بتدریج قوم مثبت رویے کی جانب گامزن دکھائی دیتی ہے ۔ مسلمانوں نے جب سے تعلیم کا خرچ بوجھ سمجھنا شروع کردیا تھا ، وہ بہت تیزی سے تنزل کی جانب روانہ ہوگئے تھے۔ اسی ساری صورتِ حال کی عمدہ اور مختصر عکاسی مہدی بیگم، ’’مکاتیبِ مہدی افادی ‘‘ میںیوں بیان کرتی ہیں:

> ’’آپ الندوہ کی مالی حالت کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں ۔ آج کل کے تعلیم یافتہ صحیح مذاق علمی سے قریب قریب نا آشنا ہیں اور ان کے خیال میں جہالت بھی ایک طرح کا استغنا ہے ۔ آپ جس پودھ کو تیار کررہے ہیں اس سے کچھ توقعات ہوسکتے ہیں لیکن ابھی تخم ریزی شروع ہوئی ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا قدر دان کہاں سے پیدا کیے جائیں ۔ تاہم وضع داری کا اقتضا یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ کیے جائیں۔‘‘(۱۶)

علامہ محمد اقبال(1877-1938) کے خطوط میں فلسفہ اخلاق کی بات کی جائے تو غالب کے بعد سب سے زیادہ اخلاقیات اور فلسفے انھی کے خطوط میں پائے جاتے ہیں۔ وہ چوں کہ یورپ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے تھے اور مشرق و مغر ب کے جملہ مسائل ان کے سامنے تھے۔ وہ امت مسلمہ کے نباض تھے اور ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں بھی۔ اسی سبب انھیں ان کے معاصرین میں اہم مقام حاصل تھا۔ ان کا فلسفہ اخلاق نہایت عمدگی سے فرد سے معاشرے تک کو اپنے حصار میں لیتا ہے۔ ان کی نظم و نثر دونوں ہی ان کے فلسفہ اخلاق کے تابع ہیں البتہ ان کے نجی خطوط جس طرز پر ان کے فلسفوں کا احاطہ کرتے ہیں وہ بالکل مختلف اور نیا زاویہہے۔مکاتیبِ اقبال میں فکر و فلسفہ کے حوالے سے بات کی جائے تو سعید احمد رفیق کہتے ہیں کہ فلسفہ اخلاق ہی علامہ محمد اقبال کی فکرکی بنیاد ہے۔سعید احمد رفیق لکھتے ہیں کہ:

> ’’اقبال ایک مفکر ہیں ۔ ان کے نظامِ فکر میں اخلاق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اخلاقی طو ر پر وہ قانونی نہیں بلکہ غایتی ہیں ۔ انھوں نے اخلاقی معیار کو ایک ام الفضائل کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ‘‘(۱۷)

علامہ محمد اقبال کے خطوط ہر حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ ان میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مطابق فلسفہ اخلاق کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار و افکار کی توضیح ، ان کی فکر کاتدریجی ارتقا اور پس منظر کی وضاحت اورسوانحی حالات و واقعات بھی موجود ہیں۔

عالمی اخلاقیات کے حوالے سے مسلمانوں کو یکجا کرنا اور عصرِ حاضر کے مسائل سے آگاہ کرنا بھی علامہ محمد اقبا ل کے منشور میں شامل رہا ہے۔ان کے مکاتیب میں فلسفہ اخلاق کے ساتھ ساتھ دیگر کئی اور فلسفے بھی موجود ہیں۔ فلسفہ موت و حیات کے بارے میں ان کے بہت سے مکاتیب موجود ہیں ۔ ان کے نزدیک موت اصل حیات ہے لیکن انسان کا دنیا سے جانا بہرحال تکلیف دہ عمل ہے۔ اگر والدین کا کوئی بچہ فو ت ہوجائے تو ان کے غم کے لیے تعزیتی الفاظ کا انتخاب یقینا نہایت مشکل کام ہے۔ علامہ محمد اقبال کے بہت اچھے دوست جن کے نام ان کے بہت سے خطوط موجود ہیں مہاراجہ کشن پرشاد کے ساتھ خطوط میں ان کے ہاں فلسفہ موت و حیات کے مباحث موجود ہیں ۔ بالخصوص و ہ خطوط جن میں مہاراجہ کشن پرشاد کے بیٹے کے انتقال پر تعزیت کی گئی ہے وہ اس حوالے سے ان کے نظریات پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ ان کے نزدیک موت ایک پر اسرار راز ہے جس تک انسان کا ایقان تو ہے لیکن رسائی اور اس کے مشمولات کا مکمل ادراک اس کے بس کی بات نہیں۔ ویسے تو علامہ محمد اقبال کی تحاریر میں کل نظامِ عمل فلسفہ حیات ہی سے جڑا ہوا ہے۔ان کے نزدیک زندگی فلسفہ حرکت وحیات ہے ۔اس حوالے سے سید محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

> ''نہایت وحشت ناک خبر موصول ہوئی یعنی یہ کہ راجہ عثمان پرشاد سرکار کو داغ فرقت دے گئے ہیں ،کیا کہوں کس قدر تکلیف روحانی اس خبر کو سن کرہوئی۔ آپ کی نگاہ نظامِ عالم کی حقیقت پر ہے اور آپ کا قلب ان تمام کیفیات سے لذت انداز ہوچکا ہے جس کو رضا و تسلیم کہتے ہیں ۔ پھر میں کیسے تلقینِ صبر کروں ۔ زندگی اور موت ایک عجیب راز ہے ، خصوصاً بچوں کی موت تو ایک ایساسربستہ راز ہے کہ اس کا انکشاف حضرت انسان سے ممکن نہیں ۔ ''(۱۸)

اسی طرح پروفیسر آل احمد سرور(1911-2002)کے مکاتیب کی بات کی جائے تو اس میں بھی جا بجا اخلاقی حوالے ملتے ہیں۔ وہ چوں کہ اعلیٰ درجے کے محقق اور نقاد بھی تھے اس لیے ان کے تبصرے بے لاگ، متوازن اور عمدگی کی مثالیں ہیں ۔ وہ جہاں دیدہ آدمی تھے اس لیے ان کے مکاتیب میں عصریمسائل، پند و نصوح اور مہر و محبت سبھی کچھ موجود ہے۔ وہ چوں کہ مختلف رسائل کے مدیر بھی رہے اس لیے انہوننے کثرت سے ادبا و شعرا کو خطو ط لکھے اور ان کے حال سے بھی با خبر رہے ۔ وارث رفیع نے ان کے مکتوبات کی تدوین کی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور مکتوب الیہ کو ان کے نام ایک مکتوب میں ان کی کتاب ''اردو کی پہلی کتاب'' پر داد دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ یہ ہر حوالے سے عمدہ ہے اور گو کہ انہوننے ادبی کاموں میں اپنا نام بنا لیا ہے لیکن بہتر ہے گروپ بندی سے دور رہا جائے تاکہ ادبیت پر کسی قسم کا بوجھ نہ پڑے اور نہ ہی ایک جانب سے دماغ بند ہو کرکسی ایک گروہ کے افکار ہی کا حصہ رہ جائے ۔ آخر میں وہ دعائیہ کلمات سے خط کا اختتام کرتے ہیں ۔ملاحظہ کیجیے:

> ''اردو کی پہلی کتاب میں نے غور سے دیکھا ۔ کشمیر کے ماحول کی رعایت کے ساتھ میرے نزدیک اس میں جس طرح بتدریج مہارت کے لیے فضا پیدا کی گئی ہے وہ اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ذخیرہ الفاظ بھی مناسب ہے۔ کاش یہ سلسلہ مکمل ہوجاتا تو بہت مفید ہوتا۔ مجھے تمھارے علمی اور ادبی کاموں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ تم نے اب تعلیمی حلقے میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ ذرا گروپ بندی سے علحدہ رہو۔ ''(۱۹)

یوں درج بالا خطوط کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اردو خطوط نگاری نہ صرف آغاز سے ہی مختلف فلسفے اپنے اندر سمائے ہوئے تھی بلکہ فلسفہ اخلاق اس میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو مکتوب نگاروں (مرزا اسد اللہ خاں غالب،سر سید احمد خاں، اکبر آلہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، علامہ محمداقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریا آبادی اور غلام رسول

مہر) نے اپنے مکتوبات میں کسی بھی مقام پر اخلاقیات کا دامن نہیں چھوڑا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مکتوبات نہ صرف ان کے فلسفہ اخلاق کے آئینہ دار ہیں بلکہ اس میں دیگر فلسفے مثلاً فلسفہ موت و حیات، فلسفہ صبر و رضاو تسلیم ، زمان و مکاں کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن ،فکر و تخیل اور مذاقِ علمی تک کی واضح تصویر موجود ملتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دہلوی، احمد سید،مرتب: فرہنگِ آصفیہ(جلد اول)، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈاردو بازار، لاہور: ۱۹۷۴ء ص ۳۸:
۲۔ زاہدمحمود قاسمی، علامہ،مترجم: احترامِ آدمیت ازعلامہ ابن ابی الدنیا،لاہور:بیکن بکس، س ن ،ص:۳۱
۳۔ محمد حفظ الرحمن سیوہاروی، مولف، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۱۹۶۲ء، ص :ہ
۴۔ سید احمد عروج قادری، مولانا، قرآن کا فلسفہ اخلاق ،نئی دہلی: مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۲۰۱۴ء،ص:۲۵
۵۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مولف، اقبال ایک مطالعہ ، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۷ء، ص:۲۳۹
۶۔ رجب علی بیگ سرور، انشائے سرور مقفیٰ،لکھنو: منشی نول کشور، ۱۹۱۶ء،ص:۹
۷۔ بیگم نیلو فر احمد، ڈاکٹر، اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اورغالب، نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص:۷۰
۸۔ ایضاً، ص:۷۵
۹۔ غلام امام شہید، مولوی، انشائے بے بہار خزاں،لکھنو:چھاپہ خانہ منشی نول کشور ،۱۸۸۹ء،ص:۵۵
۱۰۔ خلیق انجم، مرتب: غالب کے خطوط، جلد اول ،اشاعت سوم، ۲۰۰۸ء، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ، ص:۲۷۷
۱۱۔ وقار عظیم، سید،پروفیسر، مضمون: غالب کے خطوط میں سوانحی عناصر،مشمولہ: تحقیق نامہ جولائی تا دسمبر ،شمارہ :۱۳، ۲۰۱۳ ،لاہور: جی سی یونی ورسٹی، ص:۲۰۶
۱۲۔ صغیر افراہیم، پروفیسر، مضمون: مکتوبات سر سید کا معروضی تجزیہ، مشمولہ:فکر و نظر، سر سید نمبر،جلد نمبر۵۴، شمارہ نمبر۱، علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی،۲۰۱۷ء، ص :۳۳۵
۱۳۔ دور آفریدی ، مرتب، مکاتیبِ معاصرین،رام پور: اردو ریسرچ اکادمی، ۱۹۷۸ء، ص:۱۵
۱۴۔ ایضاً، ۱۹۷۸ء، ص:۲۵
۱۵۔ ایضاً، ص:۳۲
۱۶۔ مہدی بیگم ،مرتب، مکاتیبِ مہدی افادی، لکھنو: اردواکادمی، ۱۹۸۲ء ،ص: ۴۴
۱۷۔ ایضاً، ص:۴
۱۸۔ محمد عبداللہ قریشی، مرتب، روحِ مکاتیبِ اقبال ،طبع اول ،لاہور: اقبال اکادمی ، ۱۹۷۷ء، ص:۱۰۳
۱۹۔ وارث رفیع، مرتب، مکاتیبِ سرور،آل احمد سرور، لکھنو:پرنٹ لائن کمپیوٹرز، ۲۰۰۳ء،ص:۵۹